© rasailojaraid.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اشارات

ترجمان القرآن کے گزشتہ چند شماروں کے اشارات دیکھنے کے بعد ایک صاحبِ علم نے خاکسار کو ایک خط ارسال کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ماضی میں تو خیر جو ہوا سو ہوا۔ عوام جھوٹے وعدوں اور خوش کن نعروں کے فریب میں آکر ایک غلط فیصلہ کر بیٹھے مگر اصلاحِ حال کی اب کیا صورت ہونی چاہیے کہ اقتدار غلط ہاتھوں سے نکل کر اچھے ہاتھوں میں منتقل ہو سکے اور قوم جس مصیبت میں مبتلا ہو چکی ہے وہ اس سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے

اس خط کے اندر موجودہ حالات کے بارے میں جس کرب و اضطراب اور اس سے نجات پانے کے لیے جس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہر حساس شخص کی قلبی کیفیت کا مظہر ہے۔ اہلِ بصیرت تو ایک طرف رہے معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد بھی حال اور مستقبل کے بارے میں سخت پریشان نظر آتے ہیں اور یوں محسوس کر رہے ہیں کہ جس کشتی میں وہ سوار ہیں اس میں سوراخ ہو چکا ہے اور پانی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو رہا ہے مگر اس کے ناخدا انہیں یہی باور کرا رہے ہیں کہ سوراخ بند کرنے اور پانی نکالنے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ کشتی ابھی ساحلِ مراد پر پہنچ کر لنگر انداز ہوا چاہتی ہے۔ کشتی میں سوراخ، اس کے اندر پانی داخل ہونے اور اس کے ڈوبنے کے خدشات کا ذکر دشمنوں کا جھوٹا پراپگنڈا ہے۔ معمولی سے خطرے کو جس سے موجودہ حکمران طبقہ بخوبی نمٹ سکتا ہے کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ملک میں جو لوگ واقعی "پس چہ باید کرد" کا صحیح جواب چاہتے ہیں تو انہیں چند باتوں پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کیونکہ ان پر غور کیے بغیر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں، اور اس غور و فکر ہی میں انہیں اس بات کا جواب بھی مل سکتا ہے کہ ہم ماضی کے واقعات کو قوم کے سامنے بار بار دُہرا کر سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے کی غلطی نہیں کر رہے بلکہ ہم یہ فرض اس غرض سے انجام دے رہے ہیں کہ قوم کو متنبہ کر سکیں کہ سانپ بار بار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف روپ دھار کر اسی لکیر پر سے گزرتا رہتا ہے جس کی اسے فکر کرنی چاہیے۔

آپ ذرا اس بات پر غور کریں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری قوم عام حالات میں ہر معقول بات سنتی بھی ہے اور معقولیت کے ساتھ اس پر غور بھی کرتی ہے۔ عمل کے اعتبار سے اگرچہ اس میں کئی ایک کوتاہیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے اسلام کے ساتھ کسی حد تک وابستگی بھی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے آخر ہر فیصلہ کُن مرحلے پر یہ کیوں کسی ہیجانی کیفیت میں گرفتار ہو کر ایک ایسا قدم اُٹھا دیتی ہے جو اُسے اس کی اصل منزل کی طرف لے جانے کی بجائے اسے بالکل مخالف سمت میں لے جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر جب اس پر حقیقت عیاں ہوتی ہے تو پھر کفِ افسوس ملنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے بہی خواہ جوں توں کر کے پھر اسے راہ راست پر لانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور یہ چند قدم اُن کی رہنمائی میں صحیح سمت پر اُٹھاتی بھی ہے، لیکن جب اس راہ پر اس کے سامنے پھر فیصلہ کن قدم اٹھانے کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اسی غلطی کا ارتکاب کرتی ہے جس کا ارتکاب کر کے اس نے پہلے غیر معمولی نقصان اٹھایا تھا۔

دُور نہ جائیے ہندوستان میں انگریز کے تسلط کے بعد کے واقعات پر نظر دوڑایئے تو آپ کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ انگریز نے جس وقت اس سرزمین پر قدم رکھا اسی وقت اصحاب بصیرت نے اس خطرے کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ انگریز کی یلغار سے نہ صرف مسلمان سیاسی حیثیت سے غلام ہوں گے بلکہ انہیں ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے کی بھی پوری کوشش کی جائے گی، کیونکہ جب تک کوئی قوم ذہنی لحاظ سے کسی حاکم قوم کی غلام نہیں بنتی اس وقت تک حاکم قوم کا سیاسی تسلط دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کے بہی خواہوں نے جہاں انگریز کا سیاسی تسلط توڑنے کی کوشش کی وہاں مسلم قوم کو ذہنی غلامی سے بچانے کے لیے بھی نہایت مؤثر تدابیر اختیار کیں، جن میں سب سے کارگر تدبیر یہ تھی کہ دینی تعلیم کو عام کیا جائے اور انگریزی تہذیب و ثقافت سے جہاں تک ہو سکے نوخیز نسلوں کو بچایا جائے۔ مگر قوم کی ایک اچھی خاصی تعداد نے دُنیوی لالچ میں آکر اُن لوگوں کا ساتھ دیا جو نوجوانوں کو مغربی تہذیب میں رنگنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تہذیبی یلغار کی زد میں آکر خود اعتمادی کھو بیٹھے۔ انہیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن پر کوئی بھروسہ نہ رہا اور انہوں نے اپنی اور آیندہ نسلوں کی بہتری اسی میں سمجھی کہ مغربی افکار، مغربی آداب اور مغربی معاشرت کو اپنا کر انگریز کے ہاں رسوخ حاصل کر لیا جائے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے اندر اس خطرناک رجحان کے پرورش پانے کی مخالفت کی اولاً انہیں عقل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی بات سمجھانے کی کوشش کی کہ دنیا کی ہر تہذیب اپنی الگ فکری اساس اور نظامِ اقدار رکھتی ہے، جسے اپنا کر نہ صرف قوموں کے فکر ونظر کے زاویے بدل جاتے ہیں بلکہ خیر وشر کے معیارات بھی تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اگر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو انہیں اپنی تہذیب ترک کر کے ایک ایسی تہذیب کو اختیار نہ کرنا چاہیے جو اسلامی تہذیب کی عین ضد ہے، مگر انہیں ملت کا بدخواہ سمجھ کر ان کے خلاف جنگ شروع کی گئی اور ان کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ لوگ بد اندیش ہیں اور ملت کو دنیوی فوائد سے محروم رکھنے پر بضد ہیں۔

مغربی تہذیب کو اپنانے کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سب کے سامنے ہے کہ مسلم قوم کے جسد سے ایسے کئی اجزا الگ ہونے لگے جو شکل وصورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے مگر عادات، معاشرت، اندازِ فکر اور جذبہ واحساس کے اعتبار سے پورے صاحب بہادر اور غیر ملکی آقاؤں کے مفادات کے اہلِ فرنگ سے زیادہ خیر خواہ اور محافظ تھے۔ اس طبقے سے انگریز کو اس ملک میں اپنے پنجے گاڑنے میں غیر معمولی مدد حاصل ہوئی اور اسلامی تہذیب اور اسلامی نظامِ حیات جو اس کے ظالمانہ نظام کے خلاف ایک چیلنج بن سکتا تھا اس میں اضمحلال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ مسلم معاشرے میں سے اُسے اچھی خاصی تعداد میں ایسے مردانِ کار بھی ہاتھ آئے جو خدا اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر مادی مفادات کی پرستش پر راضی ہو گئے۔ نتیجۃً قوم کے اندر ہزاروں کی تعداد میں جعفر وصادق پیدا ہونے لگے جنہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ملت کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا۔

کسی حکمران جماعت کے لیے اس سے بڑی کامیابی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے مخالفین میں سے ایسے اہلِ غرض پیدا کرلے جو دنیوی مفادات کی خاطر اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ آ شامل ہوں اور پھر اس کا اشارہ پا کر بھائی بندوں کا گلا کاٹنے سے بھی گریز نہ کریں۔ مسلم قوم میں جب اس قسم کے مفاد پرستوں نے جنم لینا شروع کیا اور معاشرے نے بھی ان کی پذیرائی کی تو پھر ضمیر فروشی کا کاروبار خوب چمکا اور بڑی قلیل مدت ہی میں یہ قوم خوفناک قسم کے انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔

فلسفہ تاریخ کے ایک نامور مفکر سے کسی شخص نے سوال کیا کہ قومیں کس طرح برباد ہوتی ہیں تو اس نے جواب میں کہا ذہنی غلامی اور مفاد پرستی سے۔ ذہنی غلامی سے قوم کی خود اعتمادی کو دھچکا لگتا ہے اور اسے کھو دینے سے وہ اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرنے لگتی ہے اور تحفظ کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج اور دست نگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاتی ہے۔ یہی کیفیت اس کے افراد میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مفاد پرستی کے جنون میں اپنے ضمیر، ایمان، اخلاق کا سودا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ جب یہ صورتِ حال معرضِ وجود میں آجائے تو ہر وہ گروہ جو دُنیوی مفادات فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے وہ اس پر بڑی آسانی سے اپنی خدائی قائم کر سکتا ہے۔ پھر تاریخ کا یہ بھی ایک عظیم المیہ ہے کہ مفاد پرستی سے انسان کا ضمیر ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ مفاد پرستی اسے سب سے پہلے نشاط کاری میں مبتلا کرتی ہے جہاں سے وہ لُطف اندوزی کے چکر میں پڑتا ہے اور پھر جلد ہی عیش کوشی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔

مفاد پرستی کے اس روگ نے مسلمانوں کو آج تک سنبھلنے نہیں دیا۔ اس قوم کے غمگسار بار بار اسے سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر مفاد پرستوں کا ٹولہ اُن کے عزائم کو ہر بار ناکام بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ احرار، خاکسار تحریک سب ملت کو سنبھالا دینے کی متعدد کوششوں کے مختلف مظاہر ہیں اور ان سب کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما رہا ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کر سکیں۔ مگر یہ ساری تحریکات مفاد پرستوں کی تخریبی کارروائیوں کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ خود مسلم لیگ کی تحریک جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی غیر معمولی حمایت حاصل رہی وہ بھی ان مفاد پرستوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی اور وہ مقدس آرزو جس کی تکمیل کے لیے مسلمانانِ ہند نے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تھا، وہ ایک حسرتِ ناکام کی حیثیت سے دل کے گوشوں ہی میں دفن ہو کر رہ گئی۔ مسلم لیگ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب آخر اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ لوگ جو اس ملک میں انگریزی استعمار کے ایجنٹ تھے انہوں نے جب حالات کا رُخ بدلتے دیکھا اور انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اب دُنیوی مفادات کی کلید مسلم لیگ کے ہاتھ آنے والی ہے تو وہ جوق در جوق اس کی صفوں میں گھس کر اس کے بعض اہم مناصب پر قابض ہو گئے اور اس طرح قوم کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور انگریز جب عنانِ اقتدار لیگ کے حوالے کر کے یہاں سے رخصت ہوا تو اس کے یہی نمک خوار جو اس کی خوشنودی کی خاطر پشت ہا پشت سے اپنی قوم کے خلاف صف آرا چلے آرہے تھے اور جن کے ہاتھ اس مظلوم قوم کے تازہ خون سے رنگین تھے، وہ راتوں رات فخرِ قوم، متاعِ ملت، شوکتِ اسلام اور دولتِ ارضِ پاکستان بن بیٹھے اور مسلم لیگ کے غریب کارکن جن کی شب و روز کی محنت اور بے مثال جذبہ ایثار نے اس جماعت کو ایک فیصلہ کن مرحلے پر فعال جماعت بنایا تھا، وہ نہ صرف گوشہ گمنامی میں چلے گئے بلکہ اس جماعت پر بوجھ سمجھے جانے لگے اور طاقت کا سرچشمہ یہ نئے قائدین قرار پائے جنہیں اپنی غداریوں اور ملت فروشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے قوم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مُنہ دکھانے کی بھی جرأت نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔ جماعت جس کے ہاتھوں پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا وہ تعمیری صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو کر مفاد پرستوں کا ٹولہ بن گئی جسے حکمران طبقہ جس طرح چاہتا اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرتا۔

دُنیوی اغراض کا اشتراک اگرچہ چند لوگوں کو کچھ وقت کے لیے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے مگر یہ اشتراک کسی پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ یہی حال لیگ کا ہوا۔ جب تک ملک کی زمام کار مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہی اس وقت تک مفاد پرست طوعاً کرہاً اس کے دامن سے چمٹے رہے، لیکن اغراض کے ان بندوں نے جب یہ دیکھا کہ اقتدار اب ان ہاتھوں میں منتقل ہو گیا ہے جو لیگ کو ختم کر دینے کا عزم رکھتے ہیں تو یہ طالع آزما چشم زدن میں اپنی وفاداریاں بدل کر ان لوگوں کے ساتھ جا شامل ہوئے جو مسندِ اقتدار پر قابض تھے۔ یہ مفاد پرست ٹولہ کبھی ری پبلکن پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہوا، کبھی عوامی لیگ میں جا گھسا اور کبھی فیلڈ مارشل محمد ایوب کی تشکیل کردہ کنونشن لیگ کے اندر شامل ہو کر مارشل صاحب کے حق میں زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہوا نظر آیا اور اب اس کی بہت بڑی تعداد پیپلز پارٹی کے اندر دکھائی دے رہی ہے۔ اس ٹولے کے جو ارکان اپنی "کوتاہ اندیشی" کی بنا پر اپنی وفاداریاں بروقت تبدیل کرنے میں ناکام رہے وہ اب تلافی مافات کی غرض سے کسی نہ کسی طرح برسرِ اقتدار گروہ خصوصاً قائدِ عوام کو اپنی نیازمندی کا یقین دلانے میں مصروف ہیں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بننے کی کوشش میں منہمک نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں سے جب کبھی بھی گفتگو کا موقع ملا تو اُن کی باتوں سے یہی معلوم ہوا کہ انہیں نہ تو پیپلز پارٹی سے کوئی دلچسپی ہے، نہ اس کے منشور سے کوئی سروکار اور نہ قائدِ عوام سے ہی کوئی محبت اور عقیدت، اُنہیں تو بہر طور حزبِ اقتدار کے ساتھ ہی رہنا ہے کیونکہ ناجائز مراعات کے حصول کے لیے اور دُنیوی مفادات کے تحفظ کے لیے اُن کے نزدیک یہی ایک صحیح لائحہ عمل ہے۔

ہمارے ملک کے حساس اور سنجیدہ طبقے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس ملک میں آخر کیوں سیاسی استحکام پیدا نہیں ہوتا اور ایک وقت میں وہ سیاسی جماعت جو اقتدار کی تائید کے ساتھ ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوت دکھائی دیتی ہے اور جس کے سربراہوں کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں یہ نقش بٹھایا جاتا ہے کہ تاریخ انسانی میں آج تک ان کے پایے کا کوئی دوسرا مُدبّر پیدا نہیں ہوا، وہ اقتدار کے تبدیل ہوتے ہی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے، اور اس کے قائدین جو مرتبہ و مقام کے اعتبار سے قطب صاحب کی لاٹ سے بھی زیادہ بلند دکھائی دیتے ہیں وہ یکایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوام کی نظروں سے گر کر گوشۂ تنہائی میں چلے جاتے ہیں اور قوم اور اس کے معاملات سے یکسر بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں قوم اور وطن سے محبت اور اس کی خدمت کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ قوم ان ہی خواہوں کو پہلے مسندِ اقتدار پر براجمان کرے، پھر اُن سے خدمت کی توقع کرے اور قوم اگر انہیں اس شرف سے محروم کرتی ہے تو پھر اُسے ان سے کسی خیر اور اور بھلائی کی امید نہ کرنی چاہیے۔

اسی غلط ذہنیت کی وجہ سے اس ملک میں حزبِ اختلاف کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکی اور اسی بنا پر اس ملک کے رہنماؤں کو عوام کے اندر سیاسی بیداری اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کے بجائے ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ ان کے نزدیک یہ وہ "سم سم" ہے جس سے مال و دولت، عزت و شرف، جاہ و جلال، قیادت و سیادت، الغرض دنیا کی ہر قیمتی متاع کے خزائن کھل جاتے ہیں اور صاحبِ اقتدار بلا روک ٹوک اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے اُسے عوام کی فلاح و بہبود سے کہیں زیادہ دلچسپی مسندِ اقتدار سے ہوتی ہے اور وہ تمام جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر کے سب سے پہلے اس ہما کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرتا ہے جس کے سائے تلے انسان کو تمام دُنیوی برکات حاصل ہو سکتی ہیں۔

موجودہ حکمران جماعت چالیس فیصد سے بھی کم ووٹ حاصل کر کے تختِ اقتدار پر متمکن ہوئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی اکثریت اس جماعت کے حق میں نہ تھی۔ پھر برسرِ اقتدار گروہ کے "کارہائے نمایاں" بھی کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان سے عوام کے اندر حزبِ اقتدار کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ ہر شخص کے چہرے پر بیزاری کے آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود حکمران طبقہ اپنی روش میں کوئی معمولی سی تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ ملک کی جن مؤثر شخصیتوں، جماعتوں اور گروہوں سے حکمرانوں کو کسی مخالفت کا خدشہ تھا ان میں سے ایک معقول تعداد دُنیوی مفادات کے لالچ میں اُن سے وابستہ ہو گئی ہے اور وہ اپنی عافیت اور اپنے مفادات کا تحفظ اسی میں دیکھتی ہے کہ جب تک موجودہ حکمران گروہ تختِ اقتدار پر قابض رہے اس کی نیازمندی میں زندگی بسر کی جائے اور جب اس کی جگہ کوئی دوسرا گروہ اس پر مسلط ہو جائے تو پھر اُس کی چاکری اختیار کر لی جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگ شدتِ جذبات کے ساتھ طنزیہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں کہ کہاں ہیں وہ جماعتیں جو عوام کی محبت کا دم بھرتی تھیں وہ اب کیوں میدان میں اتر کر انہیں اس عذاب سے نجات نہیں دلاتیں؟ عوام کا غصہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن اگر یہ بات ناگوار نہ ہو تو ان جماعتوں کو بھی عوام سے یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ آخر وہ ہر فیصلہ کن مرحلے پر غلط قدم اٹھانے پر ہی کیوں اصرار کرتے ہیں۔ کیا جو لوگ اس وقت مسندِ اقتدار پر قابض ہیں وہ نئے چہرے تھے جن کے بارے میں انہیں کچھ علم نہ تھا؟ کیا انہیں بروقت ان خطرات سے متنبہ نہ کیا گیا؟ کیا انہیں خوش کُن نعروں کے پیچھے جو خطرناک عزائم چُھپے ہوئے تھے ان کی حقیقت نہ بتائی گئی؟ مگر انہوں نے کسی بات کی طرف بھی توجہ نہ دی اور جس فرد یا گروہ نے بھی انہیں صحیح فیصلہ کرنے کا مشورہ دیا اس کی گالیوں سے تواضع کی۔ ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے حقیقی بہی خواہوں کو لوگوں کی گالیاں سُن کر دل شکستہ نہ ہونا چاہیے اور ہر قسم کے نامساعد حالات میں خود بھی اور عوام کو بھی جادہ مستقیم پر گامزن رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن کیا عوام پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ جہاں وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کرتے ہیں وہاں وہ اجتماعی معاملات میں بھی اسی دانشمندی کا مظاہرہ کریں اور کسی فرد کو قیادت کا تاج سوچ سمجھ کر پہنائیں۔ جب تک عوام اپنے اس فرض کو پہچان کر اپنی قوت کو پوری جرأت کے ساتھ خیر اور بھلائی کے پلڑے میں ڈالنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اس وقت تک کسی صحت مند تبدیلی کا خواب، خواب ہی رہے گا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اس وقت بلاشبہ اقتدار کی تبدیلی کی خواہش عوام کے سینوں میں موجزن ہے مگر دیکھیے کہ کیا اس خواہش کے پیچھے وہ محرکات بھی موجود ہیں جن کی مدد سے کسی تصادم اور توڑ پھوڑ کے بغیر تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ کسی صحت مند تبدیلی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عوام گھٹیا مقاصد کی خاطر نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی غرض سے انقلابِ قیادت کے خواہاں ہوں۔ اور وہ اس بات کے دل و جان سے متمنی ہوں کہ نئی قیادت برسرِ اقتدار آنے کے بعد نہ صرف ان کی روزمرہ کی مشکلات دُور کرے گی بلکہ انہیں ایک ایسا نظامِ حیات بھی عطا کرے گی جو اُن کی ملی آرزوؤں کا ہر لحاظ سے مظہر ہو۔ اور اپنی ذات کی برتری قائم کرنے کے بجائے اس نظام کے نفاذ کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرے گی۔ جب تک تبدیلی کے محرکات گہرے اور معنی خیز نہ ہوں اس وقت تک اقتدار کے ہاتھوں کی تبدیلی کسی قوم کے لیے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۴۸ پر)

© rasailojaraid.com